محمّد حُسین جاہؔ

(زمانۂ تحریر: 1888 ـ 1889)

محمّد حسین جاہؔ لکھنؤ کے مشہور داستان گو تھے۔ ان کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ لکھنؤ میں منشی نَول کشور نے "نول کشور پریس" کے نام سے ایک بہت بڑا پریس اور اشاعت گھر 1858 میں قائم کیا تھا۔ اس پریس اور اشاعت گھر کے ذریعے اردو، فارسی اور عربی کی سیکڑوں اہم اور قیمتی کتابیں چھپ کر عام ہوئیں۔ 1880 کے آس پاس منشی نول کشور نے منشی محمّد حسین جاہؔ کو "طلسمِ ہوش رُبا" لکھنے کی خدمت سونپی۔ محمد حسین جاہؔ چوتھی جلد کو مکمّل ہی کر رہے تھے کہ 90-1889 میں وہ منشی نَول کشور سے کچھ ناراض ہوگئے، اور ان کی نوکری چھوڑ کر ایک اور پریس میں چلے گئے۔ 1899 کے آس پاس ان کی وفات ہوئی۔

"طلسمِ ہوش ربا" کی باقی تین جلدیں منشی احمد حسین قمرؔ نے لکھیں۔ چونکہ پانچویں جلد بہت ہی بڑی ہے۔ اس لیے اس کو دو حصّوں میں چھاپا گیا۔

"طلسمِ ہوش ربا" دراصل "داستانِ امیر حمزہ" کا ایک حصّہ ہے۔ داستانِ امیر حمزہ کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب فارسی میں بہت دن پہلے لکھی گئی تھی۔ منشی نَول کشور کا زمانہ آتے آتے یہ داستان اتنی پھیل گئی کہ

اسے 46 جلدوں میں لکھا گیا۔ ان میں سے چار جلدیں، جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا، محمد حسین جاہؔ نے لکھیں۔ باقی جلدیں احمد حسین قمرؔ، تصدّق حسین اور دو ایک دیگر داستان گویوں نے لکھیں۔ داستانوں کے اس پورے سلسلے کو داستانِ امیر حمزہ کہتے ہیں۔ یہ تمام جلدیں 1881 سے لے کر 1917 تک 24 سال کے عرصے میں نول کشور پریس سے چھپیں۔

"داستان ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جسے زبانی بیان کیا جاتا ہے۔ چاہے اسے بعد میں لکھ بھی لیا جائے۔ چاہے کسی لکھی ہوئی کہانی کو اس کی بنیاد بنایا جائے، لیکن داستان کا اصل طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ اس کو زبانی بیان کرتے ہیں۔ داستان میں کسی ایک مرکزی شخصیت کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ کارنامے عام طور پر جنگ جوئی اور حیرت انگیز مہموں کے سر کرنے پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا داستان میں طرح طرح کے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ جادوگروں، جنّوں، پریوں، دیووں، عجیب و غریب جانوروں، انسانوں اور جگہوں کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے۔ داستانوں میں بہت سے طلسم ہوتے ہیں جنھیں جادوگروں کے بنائے ہوئے مُلک، بلکہ جادوگروں کی بنائی ہوئی دُنیائیں، کہا جاسکتا ہے۔ ہر طلسم کی ایک لوح ہوتی ہے جس کو حاصل کیے بغیر وہ طلسم فتح نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ نثری اسلوب کی رنگا رنگی، واقعات کی کثرت، کرداروں اور طور طریقوں کی گہما گہمی، انوکھے پن اور دل چسپ تفصیلات کی بنا پر داستانِ امیر حمزہ کی 46 جلدیں (جو تقریباً 40 ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں) دُنیا کے خیالی ادب میں اپنی طرح کا سب سے بڑا کارنامہ ہیں۔

"طلسمِ ہوش ربا" کی تیسری جلد کا جو ٹکڑا ہمارے سامنے ہے اس میں ایک طرف تو طلسمِ ہوش ربا کا بادشاہ اَفراسیاب ہے۔ افراسیاب بہت بڑا جادوگر اور طاقت ور بادشاہ ہے۔ دوسری طرف طلسمِ نورافشاں کا بادشاہ کوکب ہے۔ اس کی بادشاہت افراسیاب سے کچھ کم ہے لیکن جادوگری میں دونوں برابر ہیں۔ افراسیاب کے طلسم پر امیر حمزہ کے ساتھیوں نے حملہ کیا ہے۔ طلسمِ نورافشاں کے بادشاہ کوکب کی ہمدردیاں امیر حمزہ کے ساتھیوں کی طرف ہیں۔ افراسیاب یہ ترکیب سوچتا ہے کہ اگر طلسمِ نورافشاں کی لوح میرے قبضے میں آجائے تو کوکب کی طاقت بہت گھٹ جائے گی۔ طلسمِ نورافشاں کی لوح ایک جادو کی پری کے قبضے میں ہے۔ جس وقت افراسیاب کی طرف سے اس پری کو یہ حکم ملتا ہے کہ لوح کو لے کر افراسیاب کے سامنے حاضر ہو تو اسی وقت امیر حمزہ کے خاندان کا شہزادہ تورج بھی کسی اور مقصد سے وہاں پہنچتا ہے۔ اس کو ایک کمان نظر آتی ہے جسے وہ اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

لوحِ طلسم کے لیے افراسیاب اور کوکب میں جنگ

گوشۂ کمان پر لکھا تھا کہ جو اِس اِسم کو پڑھے اُس سے یہ کمان کھنچے گی۔ شہزادے نے وہ اسم پڑھ کر، جو کہ گوشہ پر لکھا تھا، کمان پر قبضہ کیا اور تیروں کو بھی لیا۔ تیروں میں گانسیاں تین پہلو کی لگیں تھیں۔ سَرپا جواہر نگار تھیں، پَرِ عُقاب کے چڑھے تھے۔ موتی اُس میں جڑے تھے اور ایک طرف قبضۂ کمان پر لکھا تھا کہ یہ اسم جو قبضے کے دوسری جانب لکھا ہے، اگر تیر پر دَم کر کے لگائے تو عقابِ پری زاد کو نشانہ بنائے۔ شہزادہ حیران ہوا کہ یہ عقابِ پری زاد کون ہے؟ مگر اس کمان کو لے کر اسی راہ سے تہ خانے کے باہر آیا اور میدان میں بارہ دری سے نکل کر بیٹھا۔

اُدھر وہ پنجہ، انگشترِ تاجدار لے کر بَرُوے ہَوا پہنچا۔ طلسم میں ایک عقاب اُڑ رہا ہے کہ ہُما کی خصلت رکھتا ہے۔ نیچے کا دھڑ بالکل بہ صورت عقاب ہے۔ چہرہ بسانِ پری ہے، سینہ اُبھرا ہوا ہے، شانوں پر دو پَر ہیں۔ گلے میں بہ جائے ہیکل، لوحِ طلسمِ نورافشاں پڑی ہے۔ پنجہ نے آتے ہی انگوٹھی اس پری کے مُنھ پر دی اور آواز پیدا ہوئی کہ اے عقابِ پری زاد! بادشاہ کے پاس مع لوح جلد جا کر حاضر ہو۔ پری زاد یہ سُن کر

اُڑتی ہوئی جانبِ بادشاہِ مذکور روانہ ہوئی اور کمندِ اجل اس کو کھینچتی ہوئی، نشانۂ تیرِ قضا بنانے کو اُسی طرف لائی کہ جدھر شہزادۂ تورج تیر و کمان سے لیس بیٹھا تھا۔ اس نے سناٹا جو بالِ عقاب کا سُنا، دیکھا کہ ایک پری جس کا نصف جسم عقاب کا ہے، اُڑی جاتی ہے۔ پس یہ دیکھ کر سمجھا کہ عقابِ پری زاد، جس کا حالِ قتل کمان پر لکھا ہے، شاید یہی ہے۔ پس اس کو مارنا چاہیے، یہ سمجھ کر تیر بحرِ کمان میں پیوستہ کیا۔ لیکن وہ گلدستہ جو پنجے سے لے کر تاجدار نے سامنے رکھ لیا تھا، وہ اس واسطے بانیانِ طلسمِ نورافشاں نے بنایا ہے کہ عقابِ پری زاد پر جب کوئی آفت آنے کا موقع ہو تو یہ گلدستہ مرجھا جائے اور جب پری زاد مذکور مرجائے تو گلدستے میں فوراً آگ لگے اور جل جائے۔

چنانچہ جب شہزادے نے کمان تہ خانے سے پائی، وہ گلدستہ مرجھا گیا۔ تاجدار نے کفِ افسوس مَل کر افراسیاب سے کہا کہ اے بادشاہ ضرور عقابِ پری زاد پر کوئی آفت آئی۔ افراسیاب نے کہا: "میں خود اُس کی حفاظت اور خبرگیری کو جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر بزورِ سحر معلوم کر کے کہ پری زادِ مذکور کہاں ہے، سناٹا بھرے اسی جگہ آیا کہ جہاں شہزادۂ مذکور تیر لگایا چاہتا تھا۔ چنانچہ اِدھر تو یہ اُس جگہ پہنچا اُدھر سے شہنشاہ کوکب آفتاب بنا ہوا آگیا اور اس نے افراسیاب کو للکارا کہ "باش اے خیرہ رُو! رُکا رہ، کہاں جائے گا میرے ہاتھ سے!" افراسیاب یہ نعرہ سن کر ڈانٹتا ہوا اس کی طرف چلا۔

اس عرصے میں شہزادۂ تورج نے بسم اللہ کہہ کر تیر مارا۔ از بس کہ وہ تیر اور کمان، اس کی قضا، بانیانِ طلسم نے بنائی ہے۔ تیر بہ قدرتِ قادرِ توانا ہدفِ مراد پر پڑا۔ یعنی سینۂ پری زادِ مذکور پر لگ کر پشت کے پار نکل گیا اور جسمِ پری زاد میں آگ لگی کہ جل کر راکھ زمین پر گری اور لوح بھی

پیچ کھاتی ہوئی جانبِ نشیب چلی۔

افراسیاب نے جو لوح کو چکّر کھاتے جاتے دیکھا، از بس کہ مصروفِ جنگ کوکب سے تھا، اتنی مہلت نہ پائی جو لوح کو روک لیتا۔ پس اس جلدی میں ایک سحر پڑھا کہ ایک شیطان، منجملہ اُن شیاطینوں کے جو اُس کے قابو میں ہیں، فوراً سامنے آیا۔ اس کو حکم دیا کہ روک لوح کو! وہ شیطان چونکہ کفّارانِ جن میں سے ہے، ہاتھ تو لوح پر نہ ڈال سکا مگر ایک تختۂ سنگِ صاف بن کر زیرِ لوح آگیا کہ لوح اس پر آکر جم گئی۔ واضح ہو کہ لوحِ طلسم باطل کنندۂ سحر ہے۔ اس وجہ سے افراسیاب بزورِ سحر، پنجے وغیرہ سے اس کو رُکوا نہ سکا۔ اور جن کی قسم سے شیطان ہیں۔ گو بہ برکتِ اسمائے الٰہی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے مگر مثل اس کے کہ جیسے ساحر ہاتھ سے لوح اٹھا سکتا ہے، ویسے ہی شیطان بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں، سحر لوح پر کسی کا البتہ نہیں چل سکتا۔

فی الجملہ جب لوح، سطحِ سنگ پر جم گئی، کوکب نے چاہا، میں لے لوں اور افراسیاب نے چاہا کہ میں لے لوں۔ دونوں نے دو طرف سے حملہ کیا۔ بیچ میں اس تختۂ سنگ کو رکھ لیا اور ایک دوسرے کو روکنے لگا۔ آپس میں سحر چلنے لگے۔ جب افراسیاب نے ہاتھ بڑھایا کہ لوح اٹھاؤں، کوکب نے سحر کیا کہ ہاتھ کو پنجے نے پیدا ہو کر روک لیا۔ ان نے سحر پڑھا کہ پنجہ جل گیا۔ اور اس نے جب ہاتھ بڑھایا، افراسیاب نے سحر کیا کہ پرچھائیں ظاہر ہو کر ہاتھ میں لپٹ گئی۔ اس نے افسوں دَم کر کے پرچھائیں کو نابود کر دیا اور ایسا سحر پڑھا کہ آندھی بڑے زور پیدا ہو کر اشجارِ روے زمین کو اُکھاڑنے لگی۔ افراسیاب نے جادو کیا کہ کوہستان سے ایک لکّۂ ابرِ سیاہ اُڑتا ہوا آیا اور تمام عالم پر محیط ہو کر، وہ کالی گھٹا بن کر چھایا کہ دُنیا تاریک

ہوگئی اور اس گھٹا سے سیاہی برسنے لگی۔ یعنی کاجل جھڑنے لگا۔ جس نے یہ تاثیر اُلٹی بخشی کہ چشمِ جہاں، یعنی دیدۂ آفتاب، کو کالا کر دیا۔ بالکل نورِ مردکِ فلک جاتا رہا۔ ہر سمت اندھیرا گھُپ ہوگیا۔ اس اندھیرے میں نئی نئی شُعبدے بازی اور سحرسازی دونوں بادشاہوں میں آغاز ہوئی۔ کبھی کبھی دونوں کے نعروں کی صدا آجاتی تھی، ورنہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔

معنی اور اشارے

گانسی = تیر یا بھالے کا سرا جو لوہے کا بنا ہوتا ہے۔

سَریا = لوہے کی چھڑ یا بانس کی پتلی ڈنڈی

پنجہ = جادو سے بنے ہوئے ہاتھ جن کے ذریعے جادوگر چیزوں کو بھیجنے یا اُٹھوانے کا کام لیتے تھے۔ یہ لڑائی میں بھی کام آتے تھے۔

انگشترِ تاجدار = تاجدارِ گنبد نشیں نامی جادوگر کی انگوٹھی۔ طلسمِ نور افشاں کی لوح کا نگہبان یعنی تاجدارِ گنبد نشیں پنجے کے ذریعے اپنی انگوٹھی بھیجتا ہے۔ اس انگوٹھی کے اثر سے عقابِ پری زاد، افراسیاب کے پاس آجائے گی۔

ہیکل = ہنسلی یا تعویذ کی طرح کی چیز جو گلے میں پہنی جاتی ہے۔

سناٹا = سائیں سائیں کی آواز جو اُڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بال = بازو

بحرِ کمان = کمان کی چٹکی

باش = ٹھہر

خیرہ رو = بے حیا

فی الجملہ = پوری بات یہ ہے کہ

لکّۂ ابرِ سیاہ = کالے بادل کا ایک ٹکڑا

مردک = آنکھ کی پُتلی

غور کرنے کی بات

داستان میں دو طرح کے طرز سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ایک طرز تو یہ ہے کہ کسی چھوٹی سی بات کو بہت پھیلا کر بیان کیا جائے اور دوسرا یہ کہ تھوڑے سے وقت میں بہت سی باتیں بیان کر دی جائیں۔ جو اقتباس ہمارے سامنے ہے اس میں دوسرا طرز استعمال کیا گیا ہے۔ اقتباس کو توجّہ سے پڑھیے اور بتائیے کہ اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں انھیں کتنے حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اقتباس کے کسی ٹکڑے کو اپنی زبان میں اس طرح لکھیے گویا آپ داستان کو زبانی بیان کرنے کے بجائے اسے قصّے کی شکل میں لکھ رہے ہیں۔

"سریا" کو محمد حسین جاہؔ نے مونّث لکھا ہے اس کو مذکّر بھی استعمال کرتے ہیں۔ "شیاطین" اور "کفّار" خود جمع ہیں (شیطان کی جمع شیاطین اور کافر کی جمع کفّار)۔ محمد حسین جاہؔ نے عام لوگوں کی بول چال کے لحاظ سے "شیاطینوں" اور

"کفّاران" لکھا ہے، اس کو جمعُ الجمع کہتے ہیں۔

مشق اور مطالعہ

(1) "طلسم ہوش ربا" کا ایک خلاصہ رئیس احمد جعفری نے اور ایک انتخاب محمد حسن عسکری نے تیّار کیا تھا۔ اگر آپ کی لائبریری میں یہ دستیاب ہوں تو ان کو تھوڑا بہت پڑھ کر دیکھیے۔

(2) "باغ و بہار"، "فسانۂ عجائب" اور "طلسمِ ہوش ربا" کے جو ٹکڑے اس کتاب میں ہیں، ان میں آپ کسے سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

غزل

لفظ "غزل" کے کئی معنی ہیں: محبوب سے باتیں کرنا، عورتوں کی باتیں کرنا، عورتوں سے باتیں کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر غزل میں عشقیہ باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ غزل میں اور طرح کے مضامین بھی داخل ہوتے گئے اور آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں تقریباً ہر طرح کی باتیں بیان ہوسکتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزل آج بھی اُردو کی سب سے زیادہ مقبول صِنفِ سخن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ غزل کی ابتدا قصیدے سے ہوئی۔ قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے شروع میں کچھ اشعار معشوق کی یاد میں یا موسمِ بہار کی آمد وغیرہ پر لکھے جاتے تھے۔ ان اشعار کو "تشبیب" کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تشبیب کے مضامین پر مبنی اشعار قصیدے کے علاوہ آزادانہ بھی کہے جانے لگے اور اس طرح غزل وجود میں آئی۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن اس سے یہ مسئلہ نہیں حل ہوتا کہ جب تشبیب کے اشعار آپس میں مربوط ہوتے تھے تو غزل کے سب شعر عام طور پر الگ الگ مضمون کے کیوں ہوتے ہیں۔

ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اسلام سے قبل ہی عربی میں ایک شاعری

وجود میں آچکی تھی جسے "عذری" کہا جاتا تھا۔ یہ نام اس لیے پڑا کہ یہ شاعری عذری نامی ایک قبیلے میں بہت مقبول تھی بلکہ عذریوں کو ہی اس کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ اس شاعری کو غزل نہیں کہتے تھے لیکن اس میں غزل کی تمام صِفات موجود تھیں یعنی نظم میں ہر شعر الگ الگ مضمون کا ہوتا تھا، پہلا شعر یعنی مَطلع ہم قافیہ ہوتا تھا اور ہر نظم میں پاکیزہ محبّت کے درد بھرے مضامین بیان ہوتے تھے۔ غزل کی یہ صفت کہ اس میں زیادہ تر ہجر اور تنہائی اور دردمندی کی باتیں بیان ہوتی ہیں، اب بھی باقی ہے۔

غزل کے شعروں میں الگ الگ مضمون بیان کرنے کی رسم کو بعض لوگوں نے بہت کڑی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے جواب میں یہ کہا ہے کہ غزل کے شعروں میں کوئی ربط نہ بھی ہو تو کیا ہوا، پوری غزل کا ایک مزاج یا کیفیت تو ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ غزل میں مربوط مضامین بیان کرنے کی بھی گنجائش ہے یعنی شاعر اگر چاہے تو پوری غزل میں ایک ہی بات کو پھیلا کر کہے (اس کو "غزلِ مسلسل" کہتے ہیں) یا شاعر اگر چاہے تو غزل کے اندر قطعہ ڈال دے، جس کے اشعار مربوط ہوتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ غزل کا ہر شعر ایک پوری نظم کے برابر ہوتا ہے بلکہ ایک اچھا شعر تو ایک اچھی نظم سے بڑھ بھی جاتا ہے۔

غزل کی مخالفت میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ غیر ضروری ہیں، کیونکہ یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہے کہ غزل کے اشعار کا الگ الگ ہونا کوئی خرابی ہے۔ بات یہ ہے کہ نظم کے اصولوں کو غزل پر استعمال کرنا نامناسب ہے۔ ہر صنف کے اپنے آداب ہوتے ہیں، کسی ایک صنف کے آداب

کو دوسری صنف کے لیے ضروری نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور اگر ایسا کیا ہی جائے تو ہمیں یہ کہنے سے کون روک سکتا ہے کہ چونکہ نظم میں غزل کی طرح الگ الگ شعر نہیں ہوتے اس لیے نظم کمتر صنفِ سخن ہے؟

سچّی بات یہ ہے کہ غزل تمام دنیا کی شاعری میں لاثانی اور سب سے زیادہ لچک دار صنفِ سخن ہے۔ دنیا کی شاعری میں کسی ایسی صنف کا وجود نہیں جس میں غزل کی مانند بحر اور ردیف و قافیہ کی وحدت ہو لیکن ہر شعر اپنا الگ وجود بھی رکھتا ہو۔ غزل کی یہ صفت نہایت قیمتی ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، غزل کی ابتدا عربی شاعری کے اثر سے ہوئی اور فارسی شاعروں نے غزل کو واقعی غزل بنایا۔ گیارہویں صدی کے آتے آتے غزل ایک مشہور اور مضبوط صنفِ سخن بن گئی۔ فارسی کے ذریعے یہ کئی زبانوں تک پہنچی، جن میں ترکی اور اُردو سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اُنّیسویں صدی کے بعض جرمن شاعروں نے بھی اسے قبول کیا اور وہاں یہ Ghasel کے نام سے کئی بڑے شاعروں میں مقبول ہوئی اور آج کل ہندوستان کی کئی زبانوں میں بھی غزل لکھی جارہی ہے۔

جس طرح غزل میں مضامین کی قید نہیں ہے اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرّر نہیں ہے۔ عام طور پر پانچ سے اُنّیس اشعار تک کی غزلیں ہوتی ہیں۔ لیکن کئی غزلوں میں اُنّیس سے زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ہی بحر اور ردیف و قافیے میں شاعر ایک سے زیادہ غزلیں کہہ دیتا ہے۔ اس کو "دو غزلہ"، "سہ غزلہ" و "چار غزلہ" وغیرہ کہا جاتا ہے۔

غزل کا پہلا شعر "مطلع" کہلاتا ہے، اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مطلعے کے بعد بھی مطلع ہو سکتا ہے، اس طرح کے مطلعے کو

"مطلعِ ثانی" اور اگر اس کے بعد بھی مطلع ہو تو اس کو "مطلعِ ثالث" کہتے ہیں۔ جس طرح غزل کے اشعار کی تعداد مقرّر نہیں ہے، اسی طرح مطلعوں کی تعداد بھی مقرّر نہیں ہے۔ مطلعے کے فوراً بعد آنے والے شعر کو "حُسنِ مطلع" یا "زیبِ مطلع" کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلّص استعمال کرتا ہے، اس شعر کو "مَقطع" کہتے ہیں۔ غزل کا سب سے اچھا شعر "بیتُ الغزل" یا "شاہِ بیت" کہلاتا ہے۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں، اس کو "غیر مُردّف" کہتے ہیں۔ وہ بحر اور ردیف و قافیہ جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے، اسے غزل کی "زمین" کہتے ہیں۔

محمّد قُلی قُطب شاہ معانؔی

(1611 – 1565)

محمّد قُلی قُطب شاہ گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کا تیسرا بادشاہ تھا۔ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کے پہلے بھی کئی شاعر ہو چکے تھے، اور نثر میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، لیکن قلی قطب شاہ کے پہلے کسی شاعر کے دیوان کا سُراغ نہیں ملتا۔ قلی قطب شاہ کے زمانے میں دو اہم شاعر وجہؔی اور غوّاصؔی نام کے تھے۔ وجہؔی نے نثر میں بھی ایک مشہور کتاب "سَب رَس" لکھی ہے۔ "سَب رَس" کو بجا طور پر اردو نثر کا پہلا اعلا کارنامہ کہا جاتا ہے۔

غوّاصی جو اُس زمانے میں زیادہ مشہور نہ ہو سکا، دراصل غزل کے میدان کا مرد ہے۔ آج تقریباً چار سو سال کے بعد تو اس کی شاعری محمّد قلی قُطب شاہ اور وجہؔی دونوں سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی خوبی یہ ہے کہ اس نے غزل، نظم، قصیدہ، رُباعی، سب میدانوں میں بہت عمدہ شاعری کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قلی قطب شاہ نے روزمرّہ زندگی کے معاملات، تیوہاروں، میلوں، کھیل کود، عام طبقے کی عورتوں، پَند و نصیحت، شہروں، عمارتوں، موسموں، اسی طرح کی تمام